سجاد بابر کی شاعری میں وطن سے دوری کا دکھ

صدف عنبرین، ریسرچ اسکالر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور
پروفیسر ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار، اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

ABSTRACT:

The idea of patriotism was closely linked with the ideals of political rights, economic development and the abolition of the repressive capitalist system. Even so many urdu poets were swept away by the nationalist frenzy. Their writings clearly demonstrate how nationalist ideologies can instrumental literature towards its soft ends, turning patriotic feelings and love for the motherland into a constructive manner. The land of kpk is the land of love and affection and that's why the genres of literature have involved in it .Sajjad babar is a well-known poet of kpk who left the motherland for his job ,but during all in this era he was unable to overcome his affections towards norms and values of his motherland . Sajjad Babar is living in the intoxicating atmosphere of overseas, but he has to capitalize on the love of homeland. decorated the process in such a way that today his poetry smells of the homeland.He has beautifully mentioned the weather, civilization, culture, colors, happy mornings and evenings of his homeland in his poetry.

Key words : patriotism, motherland, literature, culture,

انسان کی فطری اور جبلی محبتوں میں انسانی قربتوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی قربتیں بھی شامل ہیں جو انسان کی رگ رگ میں رچ بس کر اس کی شخصیت اور برتاؤ کا حوالہ بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی بھرپور اور لازوال محبتوں میں ایک محبت مٹی اور زمین کی محبت ہے۔ جس کی مہک اور خوشبو ہر انسان کے لب و لہجے فن گفتگو اور برتاؤ میں شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر نظر آتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ زمین انسان کی دوسری ماں ہوتی ہے یہ بات غلط نہیں کوئی بھی شخص اپنی ماں کی عزت حرمت اور محبت پر سمجھوتا نہیں کر سکتا یہ وہ لازوال جذبے ہیں جو انسان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں انسان اور خصوصًا قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والے ان ہی جذبوں سے اپنی آنکھوں کے لئے بینائی لیتے ہیں، کانوں کے لئے سماعت لیتے ہیں، بولنے کے لئے گویائی لیتے ہیں اور دل کے لئے دھڑکنیں لیتے ہیں۔ جن سے جذبات واحساسات کی ایک وسیع کائنات جنم لیتی ہے۔ بلکہ کتنے ہی اہل فن ایسے ہیں جو موجودہ کائنات سے آگے کی بے شمار کہکشاؤں کو دیکھتے بھی ہیں۔ محسوس بھی کرتے ہیں اور یہی چیز ان کے بیانیہ میں بھی شامل ہوتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ یہ لازوال حقیقتیں کسی خطے یا کسی خاص جغرافیائی محل وقوع سے منسوب نہیں ہوتیں۔ ان کا تعلق آفاقیت سے ہوتا ہے۔اس مختصر سی گفتگو کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم سجاد بابر کی شاعری کو پڑھتے ہیں تو دیگر آفاقی موضوعات کے ساتھ ساتھ اہم ترین موضوع جو ان کی شاعری کا مضبوط اور منفرد حوالہ بنتا ہے وہ مٹی سے دوری کا دکھ ہے۔جب ہم مٹی سے دوری کی بات کرتے ہیں تو اس کے پیچھے نفسیاتی رنگوں کی ایک کہکشاں ہوتی ہے۔ جس کی شدت ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی۔ جس طرح انسانی رشتوں میں کسی انسان کے سارے بہن بھائی یکساں قربتوں کے حامل نہیں ہوتے۔اسی طرح ہر انسان اپنے گاؤں یا شہر کے حوالے سے یکساں حساس نہیں ہوتا۔

یہاں تھوڑی سی بات اس موضوع پر کرنا ضروری ہے کہ کسی بھی خطے کی دیہاتی زندگی میں بہت سی باتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں جو آسانی سے دوسرے مقامات پر نظر آجاتی ہیں۔احمد ندیم قاسمی اور پریم چند کے افسانوں میں جن دیہات کی عکاسی کی گئی ہیں وہ تقریبا ایک دوسرے کا عکس ہیں۔پنجاب کے کسی گاؤں سے ہجرت کر کے امرتسر کے کسی گاؤں میں چلا جائے تو ناسٹلجیا اسے اُداس کر دیتا ہے لیکن بہت سی باتوں میں یکسانیت اس کو تشفی بھی دے دیتی ہے۔ ہری بھری فصلیں ہوں، چوپال ہوں، جانور ہوں، جنگلات ہوں، ندی نالے ہوں، سادہ لوح کسان ہوں، یہاں تک کہ گوبر کی بو بھی انسان کو اچھی لگتی ہے لیکن شہروں کا معاملہ اس سے ذرا ہٹ کر ہوتا ہے۔انسان کی طرح شہروں کی بھی اپنی پہچان اور شناخت ہوتی ہے ۔رسوم و رواج، روایات اور تہوار ہوتے ہیں۔ ہر شہر اپنی پہچان نہیں رکھتا اس کے لیے صدیوں کا سفر درکار ہوتا ہے آپ خود دیکھیں کہ آپ اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ کراچی یا اسلام آباد کی تہذیبی اور ثقافتی پہچان کیا ہے ؟۔اس لئے وہاں رہنے والوں کے اندرونی احساسات زیادہ مضبوط نہیں ہوتے اس کے مقابلے میں اگر ہندوستان اور پاکستان کی بات کی جائے تو پشاور، لاہور، ملتان، امرتسر، دہلی، لکھنؤ اور کئی شہر ایسے ہیں جن کا نام لیتے ہی وہ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف شہر ہی نہیں ہمارے لاشعور کا حصہ ہیں۔ یہ ہماری شخصیت کی پہچان ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ یہاں کا رہنے والا یہاں سے دور ہو کر اپنی ذات میں ادھورا ہو جاتا ہے۔ سجاد بابر کے ساتھ بھی یہی المیہ رونما ہوتا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ پشاور وہ ظالم شہر ہے جس کی مٹی اپنے باسیوں کے پاؤں پکڑ لیتی ہے اور یہاں کا رہنے والا اس کے سحر اور جادو سے کبھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس کے اپنے موسم ہیں، تہذیب و تمدن ہے، دوستیاں اور دشمنیاں ہیں، تہوار ہیں، گلی کوچے اور بازار ہیں، آوازیں ہیں اور کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو یہاں کے رہنے والوں کے اندر سانس لیتی ہیں۔اب ایسے میں سجاد بابر جیسا حساس شاعر جو سمندر پار تلاش رزق کے لیے جا کر آباد ہوتا ہے۔ تو ایسے میں کیا اس کے اندر کے موسم ہرے بھرے رہ سکتے ہیں؟۔ جہاں زبان بھی الگ ہے، تہذیب بھی جدا ہے، رویئے بھی

الگ ہیں اور اپنے محبت کرنے والوں سے سے ہزاروں میل کا فاصلہ بھی ہو تو پھر اس کے پاس ایک ہی ذریعہ رہ جاتا ہے کہ وہ لفظوں کو اپنی بیساکھی بنا کر ان راستوں کی تلاش کرے جو اس کے وجود میں ٹھنڈک اور پھوار کی کیفیات کو اجاگر سکیں۔

سجاد بابر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے شعری موضوعات کو اس تناظر سے ہٹ کر نہ تو دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی پرکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے اندر سے پشاور کی بو باس کبھی نہیں نکلی۔ احمد فراز نے اسلام آباد شفٹ ہونے کے بعد ایک دفعہ پشاور سے جاتے ہوئے ایک جملہ کہا تھا کہ ایک زمانہ تھا کہ ہم پشاور میں رہتے تھے اور اب پشاور ہم میں رہتا ہے۔یہی بات سجاد بابر پر بھی صادق آتی ہے۔

سجاد بابر 6 جنوری 1940 کو حسن ابدال میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم واہ کینٹ اور پشاور سے حاصل کی۔گورنمنٹ کالج پشاور سے ایف ایس سی اور اسلامیہ کالج پشاور سے بی ایس آنرز کیا۔امریکہ کی ایک اوپن یونیورسٹی سے ایم ایس سی ٹیک کی ڈگری حاصل کی۔دوران تعلیم ہی ان کو پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں ملازمت مل گئی۔1976 کے آخر میں سجاد بابر کو سیون اپ انٹرنیشنل کمپنی کی دوبئ برانچ میں ملازمت ملی اور وہ دیار غیر میں رزق حلال کمانے جا بسے۔1982 میں آرسی کولا انٹرنیشنل سعودی عرب میں ملازمت ملنے کے موقع کو انہوں نے ضائع نہیں کیا اور سرزمین حجاز جا بسے۔جہاں وہ 1995 تک قیام پذیر رہے۔

وطن سے دوری دیار غیر میں معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک دشوار گزار مرحلہ تھا۔مگر اس ہنگامہ خیزی میں بھی سجاد بابر فن کی تکمیل کے لیے وقت نکال ہی لیتے۔اس معاشی جلاوطنی نے سجاد بابر کے تخیل سے وطن کے خدوخال کی ترتیب فراموش کر دی۔جو محبت کا ایک انتہائی اور والہانہ تصور ہے۔اس میں ایک فرد کے ذہن پر ایک حالت طاری ہو جاتی ہے جسے جذب کرتے کرتے اس کے ذائقے تو وجود میں رہ جاتے ہیں لیکن اس کے خدوخال بارہا دیکھنے کی خواہش کے باوجود جب نظر نہیں آتے تو دید کی وارفتگی اس کے اندر بگاڑ کی صورت پیدا کرتی ہے۔جو ایک نفسیاتی کیفیت ہیں اور اس کیفیت کی ترجمانی سجاد بابر یوں کرتے ہیں:

کس طرح بتائیں در و دیوار کی حالت
ایک عمر سے جو لوٹ کے گھر ہی نہ گیا ہو(1)
میں جس کسی خطے میں گیا ،میرا مقدر
سسکی وہی اشجار کی ،عالم وہی ً ہو کا(2)

وطن سے دور رنگین فضاؤں میں رہ کر بھی سجاد بابر وطن کی صبحیں، شامیں، ہوائیں، مزاج، موسم، رنگ، پھول، بہار، خزاں، پتے، بوٹے، رسوم ورواج کو ہی سرمایہ محبت جانتے ہیں۔ اور انہیں کو اپنی پہچان کا اصل حوالہ سمجھتے ہیں۔ یہ تشنگی یہ پیاس یہ بے تابانہ الفاظ اپنے وطن سے والہانہ محبت کا ہی نتیجہ ہیں

ہوا کے بین ہیں اور آس پاس کوئی نہیں
یہی بہت ہے کہ مجھ سا اداس کوئی نہیں(3)

سجاد بابر نے وطن سے دوری سے پیدا ہونے والی ذات کی تنہائی کو ایک نیا زاویہ دیا ہے۔ ہر چند وہ متعدد چہروں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔ زندگی کے نہ ختم ہونے والے ہنگاموں میں ان کی زندگی کا ایک ایک پل کٹ رہا ہے لیکن ان تمام انجمن آرائیوں اور دلچسپیوں کے باوجود جب انہیں وطن کے گلی کوچوں کی یاد آتی ہے تو وہ نہ صرف خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں بلکہ وہ تنہائی خار بن کر ان کے وجود کے ساتھ ان کے احساسات اور جذبات کو بھی لہولہان کرتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم سجاد بابر کی مٹی سے اس محبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سجاد بابر کی شاعری مختلف موضوعات سے عبارت ہے اور ان میں سے کچھ موضوعات بڑے بھرپور انداز میں ابھر کر سامنے بھی آتے ہیں۔ تاہم ان کے ہاں مٹی اور گھر سے دوری کے احساسات ایک ان دیکھے اور انجانے خوف کی پرچھائیاں نیز محاکاتی کشمکش بڑا متاثر کرتے ہیں۔"(4)

سجاد بابر نے وطن میں ہونے والے ظلم و ستم، معاشی استحصال معاشرتی اور سماجی بے انصافیوں، سماجی منافقت، طبقاتی کشمکش کے نوحوں کی بڑی عمدہ منظر کشی کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تخیل میں رعنائیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریاں بھی اپنی پوری آب وتاب سے زندہ ہیں۔ اسی وجہ سے کہیں کہیں سجاد بابر کی لہجے کی تلخی بھی ان کے کلام میں نمایاں ہو جاتی ہے مثال ملاحظہ کیجیے:

شہر والے تو ہواؤں میں گھلے زہر کا حال
رنگ تصویر سے اڑ جاتے ہیں، تب جانتے ہیں(5)
شکستہ ہو چکے ہیں بام و در اچھے تو لگتے ہیں
ذرا ویران ہیں لیکن یہ گھر اچھے تو لگتے ہیں(6)

وطن کی مٹی کی محبت نے سجاد بابر کی شاعری کو وہ رنگ دیا ہے جس نے ان کی شاعری کے کینوس کو ہرا بھرا کر دیا ہے۔ یقیناً اس موضوع کے تحت تخلیق ہونے والی شاعری میں قنوطیت کا ہونا بھی لازم ہے لیکن اس قنوطیت میں

بھی سجاد بابر بانسری کی مدھر آواز میں مایوسیوں سے بھری زندگی میں بہار محسوس کرتے ہیں۔ وطن سے دوری نے سجاد بابر کی ذات میں کئی طرح کی نفسیاتی الجھنیں بھی پیدا کی ہیں ان کے نزدیکی رشتوں کی ڈوریں بھی کمزور ہو گئیں۔ تلاش رزق میں اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ جب اپنے مشاہداتی حوالے سے اتنا اذیت ناک ہے تو اس کا تجرباتی ادراک کتنی محرومیاں لیے ہو گا۔

مسافتوں کے طلسم کی جستجو نے لوٹا
غبار بن کر بھرے گھروں سے جدا ہوئے ہیں (7)
اس کے نگر کی کسی ایک شاہراہ سے بھی
ہمارے دیس کی کوئی گلی نہیں ملتی(8)

گویا رنگ و بو کی ایک جگمگاتی ہستی میں بھی وطن سے جدائی سجاد بابر کو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ذات کا اکیلا پن اس کے وجود کو اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ کسی غمگسار کے پاس نہ ہونے پر اندر کی محرومیوں کو باہر نکلنے کے لئے وہ اشکوں کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے مثال ملاحظہ کیجیے:

دھلے مناظر جنہیں فضا سے شفق ملی ہے
میرے لئے کچھ نہیں فقط کربلا ہوئے ہیں (9)

اس وطن پرستی نے سجاد بابر کی شاعری کو حقیقتوں سے بھی روشناس کروایا ہے۔ وطن کے عصری حالات نے ان کی شاعری کو ایک نیا اور انوکھا آہنگ بخشا ہے۔ جارج لوکاچ نے اپنے مضمون "the ideology of modernism" میں حقیقت نگاری کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حقیقت نگاری کا ادب حقیقت کی عکاسی سے عبارت ہوتا ہے۔ انسان کے مجرد اور مجسم ممکنات کو اس قسم کی صورت میں انتہائی صورت سے بیان کرنا۔"(10)

سجاد بابر نے بھی داخلی اور خارجی حقیقتوں کی سچائی کو دلکش لفظوں کے لبادے میں پرو کر انسانی احساسات، ارادوں اور تخیل کو نت نئی اشکال سے ہم آہنگ کیا ہے۔ سجاد بابر نے وطن کی فضا، مٹی اور گلی کوچوں میں بکھرے ذرات کو اپنے وجود کا حصہ مانا ہے۔ ان کی شاعری میں وطن کی روایات، مٹی، لیل و نہار کے ذائقے سمائے ہوئے ہیں۔

"سجاد بابر کی شخصیت کا تخلیقی لمس اور سمندر کی طرح گہرا احساس اسے دوسرے شاعروں سے کافی حد تک مہمیز و ممتاز کرتا ہے اور وہ قافلے میں رہتے ہوئے بھی اپنی پہچان کے دیئے روشن رکھتا ہے۔"(11)

عام طور پر لوگ وطن سے باہر جانے کے عمل کو تفریح سمجھتے ہیں اور تفریح کے دوران وہ اپنی سرزمین کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتے کیونکہ جن حالات سے وہ فرار حاصل کر کے جا چکے ہوتے ہیں انہیں یاد کرنا تفریحی عمل کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہوتا ہے لیکن سجاد بابر کا حساس دل اور متجسس قلم اضطراب کے عمل سے دوچار ہوتا ہے وطن سے باہر رہ کر انھیں اپنے وطن کی مٹی کی عظمت یاد آتی ہے،

درد کے احوال میں بھی رنگ بھرنا پڑ گیا
کاغذوں پر موت لکھی اور مرنا پڑ گیا(12)
ایک توقع لے کے ٹکرایا ہوں ہر راہرو کے ساتھ
کوئی جھنجھلاتی ہوئی ٹھوکر تو گھر لے جائے گی(13)

وطن کی اس محبت نے سجاد بابر کی ذات میں داخلی کرب اور احساس تنہائی کی اذیت ناک کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ بیسویں صدی کی ہولناکیوں سے سہمے ہوئے ایک ایسے سے انسان کی مانند ہو گئے ہیں جو اندھیرا ہوتے ہی گھر کی چار دیواری میں خود کو محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ جہاں وہ ماضی کی گٹھری سے حسین یادیں نکال کر خود کو ان میں لپیٹے دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جائے۔ اس حوالے سے مثال ملاحظہ کیجیے:

پڑی ہے کوئی تو افتاد شہر پر پھر سے
ہوائیں چیختی آئی ہیں میرے گھر پھر سے(14)

دن ڈھلنے لگا ہے تو پریشان ہوا ہوں
اک بچہ ہوں دیہات کے تہوار میں گم ہو ں(15)

مسافتوں کے طلسم کی جستجو نے لوٹا
غبار بن کر بھرے گھروں سے جدا ہوئے ہیں(16)

حوالہ جات

1۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلشرز لاہور، 1989، ص25
2۔ سجاد بابر، مراحل، ترسیل پبلشرز پشاور، 1996، ص80
3۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلشرز لاہور، 1989، ص26
4۔ نذیر تبسم ڈاکٹر، سرحد کے اردو غزل گو شعراء، بخاری پبلشرز پشاور 2016، ص383
5۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلشرز لاہور 1989، ص74
6۔ ایضاً ص128
7۔ ایضاً ص142
8۔ ایضاً ص100
9۔ ایضاً ص142
10۔ رضیہ صدیقی، اردو تنقید اور حقیقت نگاری، سانجھ پبلی کیشنز لاہور 2012، ص26
11۔ نذیر تبسم ڈاکٹر، سرحد کے اردو غزل گو شعراء، بخاری پبلشرز پشاور 2016، ص384
12۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلشرز لاہور 1989، ص13
13۔ ایضاً ص72
14۔ ایضاً ص80
15۔ ایضاً ص126
16۔ ایضاً ص141